مزاحمتی اور مغائرتی وابستگی کے اظہاریے

ڈاکٹر سعادت سعید[1]

Abstract:

"Ezra Pound has given importance to direct linguistic expressions in poetry. Most of the Urdu contemporary poets seem fond of using direct narration in their poems. They seldom use those words which do not support proper presentation of poetic material. Poets of our era bring forth artistically those absolute sound forms which help them in constructing their poems with utter simplicity. The thought patterns of their poems come in to existence along with their forms. They creatively use their theoretical commitments in the contexts of the alienation prevailing in contemporary society. The poetic situation of the poet under discussion takes Artisticshape through his subjective resistance and love for humanity seeking peace and justice."

شاعری اگر طبع نازک پہ گراں گزرے تو جان لینا چاہیے کہ اس میں کچوکے لگانے والا مواد ہے۔ہمارے اکثر شاعروں نے کچوکتی شاعری سے سروکار رکھنے کو گناہ کبیرہ تصور کیا ہے۔انہوں نے اپنے ہلکے پھلکے جمالیاتی بیانوں سے اپنے قارئین کو مسحور کرنے کا کام کیا ہے۔ہلکے پھلکے جمالیاتی بیان حسن آفرینی کا ماخذ بن کر خیال کی تلخیوں کو قعر عدم میں گرا دیتے ہیں۔پرندوں، تتلیوں، جھیلوں، باغوں، طلسمی منظروں، من و تو کی اوباش کاریوں اور خیالی خوبصورتیوں کی حکایات کسے اچھی نہیں لگتیں۔شاعر اور قاری دونوں خواب آفریں خموشیوں سے بغلگیر ایک دوسرے کے جھوٹوں پر قانع پر سکون زندگی گزارنے کا کام کرتے ہیں۔شاعری کو خوب صورت جنتوں ، خواب تتلیوں اور تصور رنگیوں کے تعاقب کے لیے وقف کرتے اردوشاعر احمد شمیمی شعری تیوروں سے تا حال باہر نہیں آئے۔ایسے میں کچوکتی شاعری اپنے عزلت کدے میں ژولیدگی کے بوریے پہ نحیف و نزار پڑی ہے۔ (۱)

ایڈ گرایلن پو شعر کے الہامی زاویہءنظر کی شدت سے مخالفت کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فن کوئی غیر شعوری یا وجدانی چیز نہیں ہے۔ یہ فن کار کی شعوری کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ نظم کی ترکیب کے عمل کو کیفیتِ جنون میں کہے گئے اشعار سے زیادہ اہم گردانتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ روحانی ترفع اور اشتعالِ جذبات میں جس حد تک کوئی نظم معاون ثابت ہو، اسی حد تک وہ نظم، نظم کہلانے کی مستحق ہوگی۔ طویل نظم میں اشتعالِ جذبات کی وہ شدت جس کی بنا پر ہم کسی نظم کو نظم قرار دیتے ہیں، شروع سے آخر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ پو کے نزدیک شاعری نہ تو تقلیدِ فطرت ہے اور نہ ہی ہم اسے جذبات کے اظہار سے مختص کر سکتے ہیں۔ وہ شعورِ حسن کو انسانی روح کی گہرائیوں میں پوشیدہ ایک لافانی جذبہ تصور کرتا تھا۔

> ''یہی جذبہ مختلف ہیئتوں، آوازوں، خوشبوؤں اور ان احساسات کے ذریعے، جن کے درمیان انسانی وجود قائم ہے، مسرتوں کا سامان مہیا کرتا ہے''۔ اس نے شعری آہنگ کے بارے ایک اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعری موسیقی کو غیر واضح اور معنی خیز ہونا چاہیے۔ ابہام کا عنصر اس کی موزونیت کا لازمی جزو ہے۔ ''(۲)

شاعروں کی عبرت آموز روحوں کی اذیت ناک تنہائیاں، بیگانگیاں، دردناکیاں، پریشان خیالیاں

---

[1]ممتاز پروفیسر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

انہیں ژولیدہ مو ، سربزانو اور خود مست رہنے کا عندیہ دے رہی ہیں۔ وہ نہ تو اداسی کو پر جمال دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے کچوکوں کے زہر کو رنگ بازیوں سے قند میں بدل سکتے ہیں۔یعنی وہ جو گھڑی بھر میں سو بار مرتے ہوں انہیں زندگی کی جمالیاتی نشہ آوریوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔انہیں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے بلیک وارنٹوں پر دستخط ہو چکے ہیں۔وہ اپنی راتیں اپنے جلادوں کے ساتھ جاگ کر گزارنے کی خواہشوں کا اظہار کرتے ہیں۔زندگی کے گھپ اندھیرے میں، ہوائیں محبّت کی قَسمیں کھا بھی رہی ہوں یا پرندے اپنے نشیمنوں میں کانپ بھی رہے ہوں ان کی بلا سے ۔وہ عاشق اپنی محبوباؤں کے منتظر مرنے سے پہلے ہی مرے ہوتے ہیں۔موت ان سے کیا چھین سکتی ہے۔کچوکتی شاعری کال کوٹھڑی کے بھاری درواز وں کے پیچھے مردہ پڑی ہے اور ہمارے شاعروں نے مردہ سماجی زندگی کی تصوراتی خوبصورتیوں کے لاشے چار سو بکھیر رکھے ہیں۔چاروں جانب سرمایے کے وسیلے سے بڑے بڑے قتل معاف کروا لیے جاتے ہیں اور پھر ہواؤں میں بکھرے چمکتے زر سے اتنی رنگین روشنیاں پھوٹتیں ہیں کہ مقتولوں کے بچے اپنی اپنی بھوک بھول کر پھلجھڑیوں کے رقص میں گم ہو جاتے ہیں۔

زندگی کی کال کوٹھری میں بے حال پڑے شاعروں کی شاعری میں حق گوئی اور بیباکی کی تلاش کی بھلی پوچھی ۔ان میں سے کون ہے کہ جس نے کسی نہ کسی سطح پر مصالحت کا رستہ اختیار نہیں کیا۔ سرمدی انتخاب اور منصوری اظہار کا انجام دیکھ کر سرکاری مشاعرونکی دعوتیں قبول کر نی پڑتی ہیں کہ ان کے نوزائیدہ بچے بھوک سے بلبلا رہے ہوتے ہیں۔ان کا سرو سامان بک چکا ہوتا ہے اور ان کی بیویوں کی انگلیوں میں صرف منگنی کی انگوٹھیاں باقی ہوتی ہیں۔ان شاعروں کو ان کی حق گوئی و بیباکی کی بنا پر بیچ چوراہے مار دیا جاتا ہے اور ان کے دیوانوں کے اوراق جلوسوں کی بھگدڑ میں روندے جاتے ہیں ۔

اقبال فہیم جوزی اپنی نظم ’’کاش‘‘ میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ کسی ایسے لفظ کی تلاش میں ہیں جس میں ’’تم‘‘سما جاؤ۔یوں تو ادھر ادھر بکھرے ان گنت الفاظ ہیں لیکن وہ ایسا لفظ لکھنا چاہتے ہیں جس میں اس تم کے خیالوں کے زاویے منعکس ہو سکیں، اس تم کے چہرے پر ہجر کے آنگن میں کھلتی دھوپ قلمبند ہو سکے۔اس میں اس تم کے وہ سوال آ پائیں جن کی صدا خاموشی ہے۔وہ لفظ اگر مل جائے تو اس میں اس تم کے ہونٹوں کی وہ کپکپاہٹ سما سکے جو آزادی کی دہلیز پر ٹھٹکی رہتی ہے۔شاعر جس لفظ کی تلاش میں ہے اس میں من و تو کے سمندروں جیسے رشتے کو بھی جذب ہونا ہے۔شاعر کی تمنا ہے:

’’کاش محض ایک ایسا لفظ ہی لکھ پاؤں
جو تمہارے دل کی طرح دھڑکے‘‘(۳)

اردو شاعری میں من و تو کے رشتوں کی حکایات پرانی بھی ہیں اور نئی بھی۔پرانے دور میں مجاز سے حقیقت کی جانب سفر کرتے ہوئے زیادہ تر شاعر بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ ان کا وجود خالق و مخلوق کے درمیان پردے کی طرح حائل ہے۔لہٰذاخالق تک پہنچنے کے لیے اپنے وجود کو درمیان سے ہٹانا لازمی ہے۔چنانچہ وہ کہہ اٹھتے تھے کہ ’’میں ناہیں سب توں‘‘۔نئے زمانے میں مادی حقیقت کو بنیادی تسلیم کیا گیا ہے اور ماورائی رشتوں کو ثانوی یا مجاز ی کا نام ملا ہے۔چنانچہ جیون جھیل کا نور ’’تو‘‘ سے نمودار ہوتا دیکھنے والا شاعر اس کی گدلاہٹ کو اپنی ’’میں‘‘ کے بھلاووں سے تعبیر کرتا ہے۔انسانی میں نے مادی تاریخ کے ہر دور میں فرعونیت، نمرودیت، قارونیت ، قبائلیت،جاگیرداریت ، سامراجیت کی غلاظتوں سے جیون جھیل کو گدلا کرنے کا کام کیا ہے۔ایسے میں شاعر وہ ’ ’تو‘‘ کسے کہہ رہا ہے جس کی بدولت جیون جھیل نور بھری ہے۔یہ تو وہ ہے کہ جو میں کے بھلاووں سے پاک ہے۔میں کے بھلاوے نفرت کے رزمیے پیدا کرتے ہیں۔غلامی پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔انہینانصاف کے رزمیے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔آزادی کے رزمیے بھی اس میں کو مٹانے والے ہیں۔ایسے میں اگر شاعر اپنی میں کے بھلاووں کا اسیر ہے تو اس کی مزاحمتی سائیکی اسے اپنے حقیقی

وجود کی تلاش کی جانب لے جاتی ہے۔وہ اپنی شناخت کی گو مگو میں اپنے اندر کسی حقیقی ''میں'' کی تلاش کرنے کاکام کرتا ہے۔یہ میں کسی اور کی میں ہے۔اس کے اندر موجود اس کے لیے ''تو'' کی میں ہے کہ یہ میں ، میں کے بھلاووں سے پاک تو میں ڈھلی ہے اور تو جیون جھیل کو نور سے بھرنے والا ہے۔اس حوالے سے یہ مصرعے دیکھیئے:

اپنی انا کی انی سے مت کھیل رے بالک
آنکھ میں چبھ جائے گی(۴)

محبت کیا ہے؟ کے سوال کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ کسی محبوب کے لیے اتنا آگے نکل جانا کہ دنیا کی ہر شے پیچھے رہ جائے۔ایسے میں جیون جھیل کو نور سے بھرا دیکھنے والا شاعر اس ''تو '' کا عاشق ہے جو اس کے اندر ایک حقیقی انسان کی طرح موجود ہے۔اس انسان کی بدولت جیون جھیل نور سے بھرتی ہے یا بھر سکتی ہے۔''عشق بنا تن مردہ غافل، کس گنتی وچ آئے''۔

اقبال فہیم جوزی اپنی نظم پہلا قدم میں کہتے ہیں:

ہاں یہی محبت ہے
بادلوں سے، مسکان سے اور بہاو سے
ہو جائے؟
ہاں یہی محبت ہے!
یہی سرشار پوریں
چھو لیں اس گھاو کو جو ابد کے پاتال میں،
دھڑکتاہے (۵)

''میں کوئی اور '' کی نظموں میں اقبال فہیم جوزی نے اپنے وجود کے جوہر کی شناخت اس ''تو'' کی صورت کی ہے جو انسانی وجود کے باطنی معانی سے لبریز ہے۔شاعر اپنے زمانے کے مادی میکدے میں معانی کا سوال اس لیے کرتا ہے کہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بھلاوے والی میں نے جیون جھیل کو گدلا کر رکھا ہے۔اسے بھی میر کی طرح سے آدم نہیں ملتا۔صورت آدم تو بہت نظر آتے ہیں البتہ وہ وحشی درندوں کی خصلتیں رکھتے ہیں۔انہوں نے اپنے وجود کے ناپاک حربوں سے جیون جھیل کا پانی گدلا کر رکھا ہے۔ایسے میں اقبال فہیم جوزی کو شاعر بن کر اپنے اندر کے شہر کی اندھیری رات میں چراغ لے کر گھومنا پڑتا ہے تووہاں اسے انسانوں کی بجائے وحشی درندوں کی صورتیں نظر آتی ہیں۔تو پھر اسے کہنا پڑتا ہے کہ وہ جو کچھ تھا وہ کہیں اس کے باطن میں کسی اور وجود یا تو کی صورت پوشیدہ ہے اور اسے اس تو ہی کی آرزو ہے جو اس کی جیون جھیل کو نور سے بھر دے۔تب اسے مولانا روم کی طرح احساس ہوتا ہے کہ اسے اس چیز کی تلاش ہے کہ جو کمیاب ہے ۔شاعر اس محبوب کی تلاش میں ہے کہ جو دستیاب نہیں ہے۔مادی وحدت الوجود کا حرف اول ''حقیقت'' ہے ۔جو سماجی مجاز میں کھو گئی ہے۔اسے اس مجاز کے پردے سے باہر آ کر اس تو سے یکجان ہونا ہے جس میں من و تو کی تمیز مٹ جاتی ہے۔یعنی میں کے بھلاوے اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتے جب تک کہ دنیا میں کوئی ایک وجود بھی غیر انسانی ہے۔

اقبال فہیم جوزی فکری طور پر،ہمیشہ کسی سحر میں مبتلا اسرار کے چمن زاروں میں مست تتلی کی طرح منڈلاتے رہے ہیں ۔گزشتہ چھپن برس مینان سے ہونے والی میری ہر ملاقات انوکھی اور مسحور کن کوائف سے معمور رہی ہے۔ان کی دوستی میرے لیے اس لحاظ سے قابل قدر رہی ہے کہ ہم جب بھی ملے ہینکسی نہ کسی احساساتی ،فکری یا فنی معاملے کو ایک تسلسل اور تواتر سے زیر بحث لاتے رہے ہیں۔ہم نے شاعری اور فلسفہ کے حوالے سے ان گنت مباحث کی وادیوں کی سیر کی ہے۔ان کا فکری جوہر شناسی کا رویہ اور میرا مختلف النوع زاویوں سے اس پر استفساری محاکمہ ایک مشترک قدر کے بطور ہماری دوستی کا تحفہء خاص ہے۔ان کی نیلی جلد والی نظموں کی کاپی اور میری شاعری پر مشتمل چھوٹے چھوٹے کاغذی پرزے ابتدا میں ایک دوسرے کی ذات میں اترکر ایک دوسرے کو

پہچاننے کا وسیلہ رہے ہیں۔ان کے وسیلے سے ہم راہ سخن کے ہم سفر بنے۔

اقبال فہیم جوزی کو ابتدا ہی سے اس امر کا خیال رہا ہے کہ ان کا وجود کسی ایسی طویل داستان کی صورت ہے جو ناخواندہ رہی ہے۔ان کی ایک ابتدائی نظم ''قسم'' میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ اپنی اذیتوں اور کربوں کی داستان اپنے ان دوستوں سے شیئر کرنے کے متمنی ہیں جو ان کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔دوستوں کے ساتھ ان کی مخلصانہ نسبت بسا اوقات ان کے لیے تکلیف دہ اور پریشان کن بھی ثابت ہوتی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے ہر صورت ان کا ساتھ نبھانا ہے۔

اقبال فہیم جوزی کی شاعری میں جا بجا خواب کا لفظ کسی جگنو کی طرح جگمگاتا نظر آتا ہے۔شاید اس لیے کہ انہوں نے اپنی نو عمری سے لے کر اب تک (قریباً پچپن برس) کی عمر تواتر سے خواب دیکھنے میں گزاری ہے۔ ان کے خواب متنوع منظروں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔مافوق الفطرت مناظر سے لے کر فطرت کے مناظر تک کونسا سا ایسا خواب ہے جو انہوں نے نہیں دیکھا۔ان کی تیرہ راتیں پریوں، چڑیلوں، اور ڈائنوں کے خواب دیکھتے بھی گزری ہیں۔ان میں چھلاووں اور پچھل پائیوں کے خوف بھی ابھرے ہیں۔خوبصورت موسموں، پرندوں، جھیلوں، نہروں ، دریاؤں،کھیتوں، فصلوں، پیڑوں ، شاموں، صبحوں کے اصیل خواب بھی ان کے مادی وجود سے طلوع ہوئے ہیں۔ان سب خوابوں کے درمیان انہیں اپنا وجود کسی اور علاقے سے متعلق نظر آیا ہے۔اقبال فہیم جوزی کو محسوس ہوا ہے کہ وہ حقیقت میں وہ نہیں ہیں جو وہ نظر آ رہے ہیں۔یوں ایک اور نوع کی مافوق الفطرتی ان کی روح کا عذاب بن جاتی ہے۔ ویسے تو ان کے ہر حقیقی خواب میں ایک ایسی کیفیت موجود رہی ہے کہ جسے خواب میں جاگنے کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔اس اعتبار سے ان کے خواب ان کے زندہ اور متحرک وجود کا اثاثہ بن جاتے ہیں۔

اقبال فہیم جوزی کے فکری، احساساتی اور تصوراتی مافوق الفطرتی تجربے کس حد تک ان کی نظموں کاحصہ بنے ہیں اس کے بارے میں وہ خود زیادہ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں تاہم میں بطور ایک ادنیٰ قاری اتنا ضرور کہہ سکتا ہونکہ ''میں کوئی اور'' کی نظموں کا شاعر اپنی تمام تر فکری، احساساتی اور جذباتی مغائرتوں اور بیگانگیوں سمیت ایک ایسا جیتا جاگتا انسان ہے جو ہر معاملے پر اپنے بھر پور رد عمل کا اظہار کرنے کا عادی ہے۔ اس کا جسم اگر ریزوں میں تقسیم کیا جائے اور اس کے لہو کی بوندوں کو چراغوں میں بھر لیا جائے تو اس کی داستان کے کئی حصے اظہر من الشمس نظر آئیں گے کہ وہ ایک اور جگہ اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ ''ہم نے ہر مسام میں خواب بو دیئے ہیں''۔اس اعتبار سے شاعر کا مکمل وجود خوابوں کے خزینوں سے معمور ہے۔

''میں کوئی اور'' کی نظموں میں انسان، فطرت اور زندگی کے مناظر اپنی حقیقت اور اس حقیقت کی ماورایت یا ورا الورائیت سمیت سامنے آئے ہیں ۔اس لیے اس مجموعے کی نظمیں اپنی تمام تر سادگی اور براہ راست تمثالیت کے با وجود ایسے اعماق کی حامل ہیں جن میں فطرتیت اور مافو ق الفطرتیت باہمدگر پیوست ہیں۔با ایں ہمہ یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہے کہ ان نظموں میں شاعری کے قلبی گیتوں یا خوابوں کی تالیں دھڑکتی ہیں۔ان کی نظموں میں موجود فکری اعماق صدا در صدا اور دیپ در دیپ پھیلنے کا جوہر لیے ہوئے ہیں۔ اقبال فہیم جوزی نے ایسے لہراتے خواب قلمبند کیے ہیں کہ جو نیلی ہواؤں کے مرغولوں میں جھومنے اور '' آنکھوں آنکھوں بڑھتے جانے کے امکانات رکھتے ہیں۔

اردو تنقیدمیں ذات اور وجود جیسے الفاظ کی جگالی عمومی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یہ الفاظ بطور مجرد تاثر کے استعمال ہونے لگے ہیں۔سطحی نقاد یہ نہیں جانتے کہ ان لفظوں کی ٹھوس معنویت کیا ہے۔شاعر کی ذات کسی ''ثقافت کے بہاؤکا حصہ ہے۔یہ کسی تہذیبی جھیل سے متعلق ہے۔اس کا وجود کسی سماج، معاش، اخلاق، رہتل، سیاسی نظام اور ماضی سے مربوط ہے۔ شاعر اپنی تہذیبی جھیل کی پر سکون سطحوں پر اپنے خیال کے کنکروں سے دائرے بنانے کا کام کرتے ہیں۔یہ دائرے بقول اقبال فہیم جوزی ''پھیلتے پھیلتے آفاق میں کھو جاتے ہیں''۔ ان دائروں کی قسمت میں پلٹاؤ نہیں ہے

اس لیے وہ اپنے محکوم سفر کی داستان کہنے سے قاصر ہیں۔زندگی کا سفر ایسے ہی دائروں کا سفر ہے ۔گزرتے وقت کا لوٹنا ممکن نہیں۔ اس لیے شاعر کی ذات اور وجود ہمہ وقت تغیر اور تبدیلی کی زد میں رہتے ہیں۔میکدے سے جوانی اٹھا کر لانا ناممکن ہے۔ بازگشت تصور کی حد تک ممکن ہے لیکن حقیقت میں پلوں کے نیچے سے بہہ جانے والا پانی اپنی اصل حالت میں واپس نہیں آ سکتا۔ اقبال فہیم جوزی نے اس ہیرا قلیطی تصور کو اپنی ابتدائی نظم ''واپسی'' میں تسلیم کر لیا تھا اورواضح طور پر اعلان کر دیا تھا کہ جھیل میں بننے والے دائرے لوٹ نہیں سکتے اس لیے محبوب کو وہ محبت بھی نہیں مل سکتی جو کسی اور زمانے میں اسے میسر تھی۔ اس پس منظر میں اقبال فہیم جوزی کی یہ نظم دیکھئے:

ایک خط کی چند سطریں
لیکن
اتنے ہی فاصلے ہیں
اتنے ہی پت جھڑ ہیں
اور پتّے ہیں
اور برکھا میرے چاروں اور برس رہی ہے
تم آو تو میرے خواب لیتی آنا
جو میں نے تمہارے تکیے تلے رکھے تھے
اور میری آنکھیں بھی کہیں تمہارے بکس میں ہونگی
اور ہاں
ہاتھ بھی
میرے بوسے بھی
جو تم کہیں رکھ کر بھول گئی تھیں

جب سرما کی دھوپ
حد نظر تک پھیلی السی کی گہری گلابیوں پر مہکی تھی
اور ڈھلتی دوپہر میں
یوکلپٹس تلے بچھی سفید کرسیوں کے
سائے گہرے ہو گئے تھے
ان لمحوں کی باتیں لیتی آنا(٦)

تو ظاہر ہے ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔اور بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے کے مصداق کسی کو پہلی سی محبت لوٹائی نہیں جا سکتی۔اقبال فہیم جوزی کی محبت کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں ان کا تصور وقت ہمہ وقت اپنی چھب دکھلاتا ہے۔اگر کوئی شاعر یا مفکر مطلق محبت، مطلق دوستی، مطلق نظریہ، مطلق تصور، مطلق نصب العین، مطلق انداز شعر، مطلق فکر، مطلق احساس اور مطلق جذبے پر قائم رہنے کی سعی کرے گا تو وہ سکون،انجماد اور ٹھہراؤ کی طرف لوٹنے کی ناکام کوشش کرے گا۔ اس پس منظر میں اقبال فہیم جوزی کی نظموں کا مطالعہ قاری کو اس امر کی طرف لے جائے گا کہ شاعر زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات اور وجود کی حالتوں کو منقلب ہوتا نہ صرف دیکھ رہا ہے بلکہ ان حالتوں کا نظموں میں اظہار بھی کر رہا ہے۔ البتہ وہ جس سیاسی نظام کا حصہ ہے اس میں تبدیلی یکسر نہیں آتی یعنی ملوکیت سے جاگیرداری ، جاگیر داری سے سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے عوامی انقلاب تک کے مرحلے کافی طویل ہو سکتے ہیں۔

اقبال فہیم جوزی کا کہنا ہے:

یہ ثقافت کا بہاو ہے!
گھٹنوں چلتے گنجے سر تہذیبوں کا رزمیہ پڑھتے ہیں،
حکومت بدلتی ہے ، تو اسی رزمیے میں نئے ناموں

کا اضافہ کرتے ہیں؛
درباری وہی ہیں؛
صرف دربار بدلتا ہے (۷)

اقبال فہیم جوزی کی کی نظموں مینموضوع اپنی ہیئت ساتھ لاتا ہے ۔ انہوں نے سسٹم یا دربار کو بازار سے ملا کر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بازار میں ردی اور نظریات ایک ہی سطح پر آ جاتے ہیں۔سب کچھ شعبہ جاتی بنا دیا گیا ہے۔بازار سے لے کر سٹاک ایکسچینج تک سرمایہ پرستی کا جنگل اپنے رنگ دکھا رہا ہے۔اقبال فہیم جوزی نے براہ راست اظہار کی ورڈز ورتھی روایت کو اپنا کر اپنی نظموں میں مزاحمتی اور مغائرتی وابستگی کے رزمیے کی بنیادوں کی تفہیم کی ہے۔

ایذرا پاؤنڈ نے شاعری میں شے کے براہ راست اظہار کو اہم قرار دیا، چاہے وہ شے داخلی نوعیت کی ہے یا خارجی نوعیت کی۔ وہ ایسے لفظ کے استعمال سے پرہیز کرتا ہے، جو مواد کی پیش کش میں معاون ثابت نہیں ہوتا۔ اسے مطلق آہنگ پر یقین ہے۔ اس مطلق آہنگ پر،جو شاعری میں بیان ہونے والے جذبے اور اس کی تخصیصی کیفیت سے مطابقت رکھے، وہ لفظ کی طرح آہنگ کو بھی معنی کی وضاحت کا ذریعہ جانتا ہے۔ ہیئت کے مسئلے کی توضیح کرتے ہوئے اس نے لکھا:

> ''میں سمجھتا ہوں مواد رواں بھی ہوتا ہے اور ٹھوس بھی، اور یہ کہ کچھ نظموں کی ہیئت ایسی ہوتی ہے جیسے طشت میں گرتا ہوا پانی، اور کچھ نظموں کی ہیئت ایسی ہوتی ہے جیسے درخت کا تنا۔ مقفیٰ اصناف کے بھی کچھ فائدے ہوتے ہیں اور بہت سے ایسے موضوعات بھی ہیں جو ان اصناف میں پیش نہیں کیے جا سکتے ہیں۔''(۸)
>
> ''جان کرو رین سم کے نزدیک فن پارے میں ہیئت اور موضوع کی تفریق بے معنی ہے۔ فن پارہ ایک کلی وحدت ہے۔ اس کی تفہیم اس کی لفظی تنظیم کے حوالے سے ہو سکتی ہے۔ یہ لفظی تنظیم فن پارے کے ہیئتی کل یا فارم کی شناخت کا باعث بنتی ہے۔''(۹)

''میں کوئی اور'' کے اسلوبی سلسلے شاعر کے حسی اور جوہری فکری نظام کی پہلو داریوں سے آنچ لیتے ہیں۔اس میں قدیم مابعد الطبیعیاتی شور انگیزیوں اور جدید خوابگوں رومانویت کی افیون مستیوں سے دانستہ کنارہ کشی کی گئی ہے۔ ''میں کوئی اور'' کا اثباتی سیاق و سباق شاعر کی سماجی ذاتیات سے عبارت ہے۔ ایسی سماجی ذاتیات کہ جو خوابگوں تخلیوں کی عکاسی سے مربوط ہے۔ اس مجموعے کی نظموں میں شاعر کے شعری باطنی معروض کی سدا بہار موسیقی کی لہریں موجزن ہیں۔اقبال فہیم جوزی کی نظموں میں ان کے عقلی تجربوں میں گندھی ان کی داخلی بیگانگی سادہ اظہاریوں کی صورت سامنے آئی ہے۔

نئی اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ وہ شاعری کے روایتی قاری سے محفوظ رہی ہے۔نیا قاری نئی شاعری کے سمندرپر لٹکے سسپنشن برج کے اوپر سے گزر کر جس وادی میں پہنچا ہے اس پر نئے اختر شیرانیوں کا طوطی بول رہا ہے۔ایسے مینشاعری میں نئے انداز کی ریشمی حسیت کو فروغ ملا ہے۔یہ ریشمی حسیت معاصر اردو شاعری کی ست رنگی آوازوں کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے۔نئی شاعری کے جس سمندر کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اس کے نیلگونی معنوی اعماق نئے شاعروں کے نظمیہ مجموعوں کو اردو نظم کی تاریخ میں سنہری انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ماخذ، قدیم بنجر، یہی ہے میرا لحن جیسے مشکل اور عمیق شعری مجموعے ہوں یا کجلی بن، شناخت اور فنون آشوب جیسے عصری آگہی سے معمور کھردری حسیت کی حامل شعری تخلیقات معاصر نظم گو شعرا اور ان کے قارئین راشد کی استعارگی، مجید امجد کی براہ راستگی اور فیض کی حقیقی ۔ رومانی سنگمی سے باہر نکل کر انہیں دیکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ایسے میناقبال فہیم جوزی کے شعری مجموعے ''میں کوئی اور'' کی اشاعت ایک نئے اسلوبی تجربے کے در وا کرگئی ہے۔یہ اسلوبی تجربہ جہاں کسی حد تک میراجی ، راشد، مجید امجد کی ساختہ شعری روائتوں کے فکری اثبات سے منسلک ہے وہاں وہ شاعر کی انفرادی اپج کا مظہر بھی ہے۔

شعری ہیئت کے نئے اسرار نئی تشکیل ہی میں ظاہر ہو سکتے ہیں۔اردو نظم کی نئی اور پرانی ہیتونکے متعینہ سلسلوں کے اسرار بالتکرار ظاہر ہوتے ہوئے اب عامیانہ روپ میں سامنے آ رہے ہیں۔ اقبال فہیم جوزی نے اپنی نثری اور عروضی شاعری کو نئے سطری سانچوں میں منتقل کیا ہے ۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے پابند نظم کے قدیم تشکیلی حوالوں، آزاد نظم کے راشداور میرا جی کی بنائی ہوئی صورتوں اور نثری شاعری کے پیراگرافی انداز سے گریز کیا ہے اوران کے متوازی ایک ایسا ہیئتی ساختی سلسلہ استعمال کیا ہے جس کی مثال اس سے قبل شائع ہونے والی اردو نظموں میں نہیں ملتی۔ اپنی ان تمام نظموں کو جو پہلے مروجہ ہیئتی سانچوں میں شائع ہوئی تھیں انہوں نے نئے ہیئتی انداز میں لکھا ہے۔اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعر کے اندر بھی اس انداز کا فکری و جذباتی تواتر و تسلسل موجود نہیں ہے جو عموماً مروجہ شعری احساسات و کوائف میں نظر آتا ہے ۔ ’’میں کوئی اور‘‘ کی نظموں میں شعری سطروں کی تخصیصی ترتیب سے اندازہ ہو سکتا ہے کی شاعراپنے عہد کے ظاہری ہیئتی سلسلوں سے کوئی ربط نہیں رکھنا چاہتا۔

اقبال فہیم جوزی جس دور میں سانس لے ر ہے ہیں اس میں نظریہ اضافیت، نظریہ ڈی این اے اور نظریہ کوانٹم میکینکس کے حوالے سے کائناتی، بشریاتی اور عمرانیاتی سلاسل کی از سر نو تشریح و تعبیر ہو رہی ہے ۔ایسے میں شاعروں کو بھی یہ حق ہے کہ وہ نظموں کے پرانے تسلسلی و تواتری سلسلوں میں حسب پیمانہ ذات ردو و بدل کے عمل سے گزریں۔کوانٹم میکینکس میں ذراتی سیٹ اپ کے پرانے تسلسلی حوالے کوتسلیم نہینکیا گیا۔اقبال فہیم جوزی نے بھی مروجہ نظمیہ سانچوں کو نئی ترتیب میں پیش کرنے کا کام کیا ہے۔ یہ کام اس نے اپنی کسی اندرونی اپج اور مائنڈ سیٹ کے حوالے سے کیا ہے۔اس سے قاری کو رک رک کے نظم کے ساتھ چلنے کا رویہ اختیار کرنا ہو گا۔اس لیے اگر اقبال فہیم جوزی کی آزاد نظموں میں رن آن لائن کا اہتمام ہے بھی ،تو بھی ،سطروں کے نئی ترتیبی سلسلے قاری کو یہ عندیہ دیتے ہیں کہ وہ انہینروانی سے پڑھنے کی بجائے رک رک کے اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھے۔ یوں اقبال فہیم جوزی کے احساس، جذبے، مشاہدے، تخیئل اور فکر کا کوئی پہلو قاری کی گرفت سے باہر نہیں رہے گا۔ان کی نظموں کے ہیئتی سلسلوں کو ان کی زبان کی سادگی زیادہ پر تاثیر بنا دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ " میں کوئی اور " اقبال فہیم جوزی کا اولین شعری مجموعہ ہے۔یہ گزشتہ برس اسلام آبادسے شائع ہوا ہے۔

۲۔ اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک ، سعادت سعید ، ایڈگر ایلن پو کی رائے ، لاہور : سنگ میل، ۲۰۱۷ء، ص۳۱

۳۔ میں کوئی اور، اقبال فہیم جوزی، کراچی: نیلم پیپر پروڈکٹس، ۱۴۴

۴۔ ایضاًص۱۳۰

۵۔ ایضاًص۱۹۹

٦۔ ایضاًص ۱۵۱

۷۔ ایضاًص۱۴

۸۔ اردو نظم میں جدیدیت کی تحریک، ص۳٦

۹۔ ایضاًص ۳٦، ۳۷